فلسفہ سخت کوشی

اسرارِ خودی کے بعض مطالب کی توضیح کے لیے علامہ اقبال کا خط ڈاکٹر نکلسن کے نام

ترجمہ شیخ عطاءاللہ

لاہور

۲۶ر جنوری ۱۹۲۱ء

محترمی ڈاکٹر نکلسن

شفیع کے نام آپ نے جو مکتوب فرمایا ہے اس سے مجھے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ اسرارِ خودی کا ترجمہ انگلستان میں قبولِ عام حاصل کر رہا ہے۔ بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نٹشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے، دھوکا کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ دی اتھینیم والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحبِ مضمون پر عائد نہیں ہوتی۔ اُس نے اپنے مضمون میں میری جن نظموں کا ذکر کیا ہے، اگر اُسے ان کی صحیح تاریخِ اشاعت کا بھی علم ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میری ادبی سرگرمیوں کے نشو و ارتقا کے متعلق اس کا زاویۂ نگاہ بالکل مختلف نظر آتا۔

وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے خلطِ مبحث کر کے میرے انسانِ کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے قریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتابیں میری نگاہ سے گذری تھیں۔ یہ مضمون انڈین انٹی کیوری میں شایع ہوا۔ جب ۱۹۰۸ء میں مَیں نے ''ایرانی الٰہیات'' پر ایک کتاب لکھی تو اس کتاب میں اس کو شامل کر لیا گیا۔

انگریزوں کو چاہیے کہ میرے خیالات کو سمجھنے کے لیے جرمن مفکر کے بجائے اپنے ایک ہم وطن فلسفی

کے افکار کو رہنما بنائیں۔ میری مراد اعلیٰ قابلیت کے حامل الگزنڈر سے ہے جس کے گلاسگو والے گفرڈ خطبات پچھلے سال شایع ہو چکے ہیں۔ ان خطبات میں اُس نے ''خدا اور الوہیت'' کے عنوان سے جو باب لکھا ہے (صفحہ ۳۴۱ جلد دوم) وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ صفحہ ۳۴۷ پر لکھتا ہے:

گویا ذہنِ انسانی کے نزدیک الوہیت دوسری اعلیٰ تجربی قوت ہے جسے کائنات عالم وجود میں لانے کی سعی کر رہی ہے۔ قیاسی سطح پر ہمیں یہ ایقان حاصل ہوتا ہے کہ بطنِ گیتی میں اس قسم کی ایک خاصیت موجود ہے۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ وہ خاصیت کیا ہے۔ ہم نہ تو اسے محسوس کر سکتے ہیں نہ ہمارا ذہن اُس کے تصور پر قادر ہے۔ انسان ابھی تک ایک نامعلوم خُدا کے لیے قربان گاہیں تعمیر کر رہا ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ الوہیت کیا چیز ہے، اس کا احساس کیسا ہوتا ہے، اس صورت میں ممکن ہے کہ پہلے ہم خدا بن جائیں۔

الگزنڈر کے خیالات میرے عقائد کی نسبت زیادہ جسارت آمیز ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ کائنات میں جذبۂ الوہیت موجود ہے۔ لیکن میں الگزنڈر کی طرح یہ نہیں مانتا کہ یہ قوت ایک ایسے خدا کے وجود میں جلوہ آرا ہوگی جو وقت کا تابع ہوگا۔ اس باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قوت ایک اکمل واعلیٰ انسان کے پیکر خاکی میں ظاہر ہوگی۔ خدا کے متعلق میرا عقیدہ الگزنڈر کے عقیدے سے مختلف ہے لیکن اگر انگریز ان جزوی اختلافات سے قطع نظر کر کے انسانِ کامل کے تخیل پر اپنے ایک ہم وطن مفکر کے افکار کی روشنی میں نظر ڈالیں تو انھیں یہ عقیدہ اس قدر اجنبی اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوگا۔

مجھے مسٹر ڈکنسن کی تنقید بدرجہ غایت دلچسپ معلوم ہوتی ہے، اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس کے متعلق چند باتیں عرض کر دوں۔

(۱) مسٹر ڈکنسن کے نزدیک میں نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے آمال قرار دیا ہے۔ (انھوں نے مجھے ایک نجی مکتوب لکھا ہے جس میں یہی خیال ظاہر کیا ہے) انھیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں لیکن حیوانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک قوم کو حق وصداقت کی حمایت میں دعوتِ پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اُس کا فرض ہے، لیکن میں اُن تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔ (دیکھیے میاں میر اور شہنشاہِ ہند والی نظم)

مسٹر ڈکنسن نے صحیح فرمایا کہ جنگ خواہ حق وصداقت کی حمایت میں ہو خواہ ملک گیری اور فتح مندی کی خاطر، تباہی اور بربادی اس کا لازمی نتیجہ ہے اس لیے ہر حال میں اُس کے استیصال کی سعی کرنا چاہیے۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاہدے، لیگیں، پنچایتیں اور کانفرنسیں استیصالِ حرب نہیں کر سکتیں۔ اگر اس سعی میں ہمیں بیش از پیش کامیابی ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مللِ مستعمر جن ملتوں کو تمدن وتہذیب میں اپنا

ہمسر نہیں سمجھتیں، ان کے استحصال کے لیے زیادہ پرامن وسائل اختیار کرلیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی توانا شخصیت کی ضرورت ہے جو ہمارے معاشرتی مسائل کی پیچیدگیاں سلجھائے، ہمارے تنازعات کا فیصلہ کرے اور بین الاقوامی اخلاق کی بُنیاد مستحکم واستوار کردے۔ پروفیسر میکنزی کی کتاب انٹروڈکشن ٹو سوشل فلاسفی کے یہ دو آخری پیراگراف کس قدر صحیح ہیں:

کاملِ انسانوں کے بغیر سوسائٹی معراجِ کمال پر نہیں پہنچ سکتی اور اس غرض کے لیے محض عرفان اور حقیقت سے آگاہی کافی نہیں بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے جسے یوں کہنا چاہیے کہ یہ معما حل کرنے کے لیے ہم نور وحرارت دونوں کے محتاج ہیں۔ غالباً عہدِ حاضرہ کے معاشرتی مسائل کا فلسفیانہ فہم و ادراک بھی وقت کی اہم ترین ضرورت نہیں۔ ہمیں معلم بھی چاہیے اور پیغمبر بھی۔ ہمیں آج رسکن یا کارلائل یا ٹالسٹائی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ضمیر کو زیادہ کڑا اور سخت گیر بنانے اور فرائض کے دائرے کو زیادہ وسیع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ غالباً ہمیں ایک مسیح نو کی ضرورت ہے...... یہ قول صحیح ہے کہ عہدِ حاضرہ کے پیغمبر کو محض ''بیابان کی صدا'' نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس عالم کا انسان بھی ہونا چاہیے کیونکہ عہدِ حاضرہ کے 'بیابان' آبادشہروں کے گلی کوچے ہیں جہاں عروج کی مسلسل وپیہم جدوجہد کا بازار گرم ہے۔ اس عہد کے پیغمبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ہنگامہ زار میں وعظ وتبلیغ کرے۔

غالباً ہمیں پیغمبر سے بھی زیادہ عہد نو کے شاعر کی ضرورت ہے یا ایک ایسے شخص کا وجود ہمارے لیے مفید ثابت ہوگا جو شاعری اور پیغمبری کی دوگونہ صفات سے متصف ہو۔ حال کی نسلوں کے شاعروں نے ہمیں فطرت سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے۔ انھوں نے ہمیں اس قدر ژرف نگاہ بنادیا ہے کہ ہم مظاہرِ فطرت میں انوارِ ربّانی کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ لیکن ہم ابھی ایک شاعر کے منتظر ہیں جو ہمیں اسی وضاحت کے ساتھ پیکرِ انسانی میں صفات الٰہی کے جلوے دکھادے۔ ہمیں اب بھی ایک ایسے شاعر کی ضرورت ہے جو ہائنے کی طرح خود کو ازراہِ تفنن روح القدس کا سپاہی کہے جو اس حقیقت پر ہماری آنکھیں کھول دے کہ ہمارے بلند ترین نصب العین روزمرہ کی زندگی میں پورے ہورہے ہیں اور اگر اس زندگی کو ترقی دینے کی سعی کی جائے تو ہمیں محض راہبانہ ریاضت اور نفس کشی ہی کا موقع نہیں ملے گا بلکہ ایسا ارفع واعلیٰ مقصد حاصل ہوجائے گا جو تمام خیالات، تمام جذبات اور تمام مسرتوں کو ترقی کے بلند مقام پر پہنچا سکتا ہے۔

انگریزوں کو چاہیے کہ مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں انسانِ کامل کے متعلق میرے افکار کا مطالعہ کریں۔ ہمارے معاہدے اور پنچایتیں مسلسل اور پیہم جنگ وپیکار کو صفحۂ حیات سے محو نہیں کرسکتیں۔ کوئی بلند مرتبہ شخصیت ہی ان مصائب کا خاتمہ کرسکتی ہے اور اس شعر میں مَیں نے اسی کو مخاطب کیا ہے؎

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگ جویاں را بدہ پیغامِ صلح

(۲) مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے ''فلسفۂ سخت کوشی'' کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اس باب میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا مدار علیہ وہ خیالات ہیں جو میں نے ''حقیقت'' کے متعلق اپنی نظموں میں ظاہر کیے ہیں۔ میرے عقیدے میں حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے جو تصادم کے واسطہ سے ربط و امتزاج پیدا کر کے ''کل'' کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں اور یہ تصادم لامحالہ ان کی شیرازہ بندی اور ارتباط پر منتج ہوگا۔ دراصل بقائے شخصی اور زندگی کے علووارتقا کے لیے تصادم نہایت ضروری ہے۔ نٹشے بقائے شخصی کا منکر ہے۔ جو لوگ حصولِ بقا کے آرزومند ہیں وہ اُن سے کہتا ہے ''کیا تم ہمیشہ کے لیے زمانے کی پشت کا بوجھ بنے رہنا چاہتے ہو''۔ اس کے قلم سے یہ الفاظ اس لیے نکلے ہیں کہ زمانے کے متعلق اس کا تصور غلط تھا۔ اُس نے کبھی مسئلہ زمان کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بخلاف اس کے میرے نزدیک بقا انسان کی بلندترین آرزو اور ایسی متاعِ گراں مایہ ہے جس کے حصول پر انسان اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی تمام صور و اشکالِ مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے، ضروری سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک اُن سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہو، مردود قرار دیا ہے۔

میں تصادم کو سیاسی حیثیت سے نہیں بلکہ اخلاقی حیثیت سے ضروری سمجھتا ہوں حالانکہ اس باب میں نٹشے کے خیالات کا مدار غالباً سیاست ہے۔ جدید طبیعیات سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مادّی قوت کے سالمے نے ہزارہا سال تک ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد موجودہ صورت اختیار کی ہے پھر بھی وہ غیر مستحکم ہے اور اسے مٹایا جاسکتا ہے۔ قوتِ ذہنی یا یوں کہہ لیجیے کہ جسم انسانی کے ذرہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ صدہا برس کی مسلسل جدوجہد اور تصادم و پیکار کے بعد وہ موجودہ صورت تک پہنچا ہے پھر بھی عوارضِ ذہنی کے مظاہرِ مختلفہ سے اس کی بے ثباتی اور عدم استحکام ظاہر ہے۔ اگر وہ بدستور قائم و باقی رہنا چاہتا ہے تو یقیناً وہ ماضی کے درسِ عبرت کو فراموش نہیں کرسکتا۔ اُسے لامحالہ ان قوتوں سے اپنے قیام کی خاطر استمداد کرنی پڑے گی جو آج تک اُس کے استحکام کی ضامن رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ فطرت کا ارتقا ان قوتوں میں اصلاح کر دے یا اُن میں سے بعض کو (مثلاً تصادم اور جنگ و پیکار کو جو استحکام کے قوی عوامل میں سے ہیں) جو اس کے ارتقا کی کفیل بنی رہی ہیں، بالکل مٹادے اور اس کے استحکام و بقا کی خاطر بعض ایسی قوتیں عرصہ شہود میں لے آئے جن سے انسان آج تک ناآشنا رہا ہے۔ لیکن میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس باب میں میری حیثیت کسی خواب دیکھنے والے کی نہیں اس لیے میرے نزدیک اس نوع کے انقلاب کا زمانہ ابھی بہت دور ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ یورپ کی جنگِ عظیم میں انسان کی بصیرت و موعظت کا جو سرمایہ پنہاں ہے، وہ اس سے عرصۂ دراز تک متمتع نہ

ہو سکے گا۔

ان سطور سے واضح ہوگیا ہے کہ میں نے محض اخلاقی زاویۂ نگاہ سے تصادم و پیکار کو ضروری قرار دیا ہے۔افسوس کہ مسٹر ڈکنسن نے ''فلسفۂ سخت کوشی'' کے اس پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

(۳) مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے لیکن باعتبار اطلاق و انطباق، مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصبُ العین شعر اور فلسفہ میں ہمیشہ عالمگیر حیثیت سے ہوتا ہے، لیکن اگر اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطبِ اولیں نہیں ٹھیرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتی ہو، لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اِس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا، جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس، اسلام کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس خوفناک اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کر دیں۔ چونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ، جس کی بنیاد نسل یا جغرافی حدودِ ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوّت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انھیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے۔ نسل اور حدودِ ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اُسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن مَیں اس چیز کا شدید ترین مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہرِ اتم قرار دیا جائے۔ اسلام سے مجھے بے پناہ محبت ہے لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ ایسا حب الوطنی کے حوالے سے نہیں جیسا کہ ڈکنسن کا خیال ہے بلکہ عملی مقاصد کی وجہ سے ہے اور اسی باعث مَیں کسی مخصوص سوسائٹی (اسلام) سے آغاز کرنے پر مجبور ہوں۔ کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لیے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے، اور کہتا ہے:

تعالوا الی کلمة سوآء بیننا و بینکم۔

میرے خیال میں مسٹر ڈکنسن کا ذہن ابھی تک یورپ والوں کے اس قدیم عقیدے سے آزاد نہیں ہوا کہ اسلام سفاکی اور خونریزی کا درس دیتا ہے۔ دراصل خدا کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں بلکہ تمام انسان اس میں داخل ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ نسل اور قومیّت کے بتوں کی پرستش ترک کر دیں اور ایک دوسرے کی شخصیت تسلیم کر لیں۔ انجمنیں، حکم برداریاں، اس قسم کے عہد نامے جن کا ذکر مسٹر کینز نے کیا ہے، ملکیت خواہ وہ جمہوریت ہی کی قبا میں پوشیدہ کیوں نہ ہو، انسان کو فوز وفلاح سے آشنا نہیں کر سکتی، بلکہ انسانی فلاح تمام انسانوں کی مساوات اور حریت میں پنہاں ہے۔ آج ہمیں اس چیز کی ضرورت ہے کہ سائنس کا محل استعمال قطعی طور پر بدل دیا جائے۔ ان خفیہ سیاسی منصوبوں سے احتراز کیا جائے جن کا مقصد بھی یہ ہے کہ کمزور و زبوں حال یا ایسی اقوام جو عیاری اور حیلہ گری کے فن میں چنداں مہارت نہیں رکھتیں، صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح جنگ کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے بھی فتوحات کی ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ ان کے بعض قافلہ سالار ذاتی خواہشات کو دین و مذہب کے لباس میں جلوہ گر کرتے رہے ہیں۔ لیکن مجھے پوری طرح یقین ہے کہ کشور کشائی اور ملک گیری ابتداً اسلام کے اصل مقاصد میں داخل نہیں تھی۔

اسلام کو جہاں ستانی اور کشور کشائی میں جو کامیابی ہوئی ہے، میرے نزدیک وہ اس کے مقاصد کے حق میں خاصی مضر تھی۔ اس طرح وہ اقتصادی اور جمہوری اصول نشو ونما نہ پا سکے جن کا ذکر قرآنِ کریم اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جابجا آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی، لیکن ساتھ ہی ان کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا اور انھوں نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں کہ اسلامی اصولوں کی گیرائی کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔

بلاشبہ اسلام کا مقصد انجذاب ہے، مگر اس انجذاب جغرافیائی فتوحات سے ممکن نہیں بلکہ صرف اسلام کی سیدھی سادی تعلیم جو الٰہیات کے دقیق اور پیچیدہ مسائل سے پاک اور عقلِ انسانی کے عین مطابق واقع ہوئی ہے، اس عقدہ کی گرہ کشائی کر سکتی ہے۔ اسلام کی فطرت میں ایسے اوصاف پنہاں ہیں جن کی بدولت وہ کامیابی کے بامِ بلند پر پہنچ سکتا ہے۔ ذرا چین کے حالات پر نظر ڈالیے جہاں کسی سیاسی قوت کی پشت پناہی کے بغیر اسلام کے تبلیغی مشن نے غیر معمولی کامیابی حاصل کر لی اور لاکھوں انسان اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے۔ مَیں بیس سال سے دنیا کے افکار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس طویل عرصے نے مجھ میں اس قدر صلاحیت پیدا کر دی ہے کہ حالات و واقعات پر غیر جانبدارانہ حیثیت سے غور کر سکوں۔

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوتِ طلب وجستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز

رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کرلیا جائے جس کا مقصدِ وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے اور حسنِ معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گراں مایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیضِ صحبت سے حاصل ہوسکتی ہے۔

میں اس بارے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسرارِ خودی پر چند تشریحی نوٹ لکھے تھے جنھیں آپ نے دیباچہ اسرار میں شامل کرلیا ہے۔ ان تفسیری حواشی میں مَیں نے مغربی مفکرین کے افکار و عقائد کی روشنی میں اپنی حیثیت واضح کی ہے۔ یہ طریق محض اس لیے اختیار کیا گیا تھا تا کہ انگلستان کے لوگ میرے خیالات بہ آسانی سمجھ لیں۔ ورنہ قرآن حکیم، صوفیائے کرام اور مسلمان فلسفیوں کے افکار سے بھی استدلال کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اسرار کے پہلے ایڈیشن میں بزبانِ اُردو جو دیباچہ لکھا ہے اس میں یہی طریقِ استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیا اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے اور تو اور وقت کے متعلق برگساں کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لیے نئی چیز نہیں۔ قرآن الٰہیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کی معاش و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا تعلق الٰہیات ہی کے مسائل سے ہے۔ عہدِ جدید کا ایک مسلمان اہلِ علم جب ان مسائل کو مذہبی واردات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے جن کا مبدا اور سرچشمہ قرآنِ مجید ہے، تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جارہا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اہلِ مغرب اسلامی فکریات کی تاریخ سے ناآشنائے محض ہیں۔ اے کاش مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے روشناس کر دیتا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے فلسفیانہ خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ ہیں۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال